نام کتاب : "عکس واثر (مجموعۂ مضامین)"

مرتب : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
(اعزازی رفیق، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ)

ناشر : ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، انڈیا

قیمت : ۳۰۰ روپے

صفحات : ۲۰۸

طبع اوّل : مارچ ۲۰۱۳ء

تبصرہ نگار : پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج ❁

زیرِ نظر کتاب، مصنف کے بہ قول، ان کے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے، جیسا کہ سرِ ورق پر تحریر ہے، مگر تبصرہ نگار کے نزدیک ان میں سے چھ مضامین کو مقالات میں شمار کیا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ وہ تحقیقی اسلوب کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔ مصنف نے غالباً انھیں اکثر کا اعتبار کرتے ہوئے مضامین کے زُمرے میں رکھا ہے۔ ازروے تحقیق، مضمون اور مقالے میں جو فرق سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مطابق لکھنے والا جب اپنی تحریر مختلف حوالوں سے مزیّن و مدلل کرتا ہے تو اسے مقالہ کہا جاتا ہے اور جب کوئی تحریر اس اہتمام سے معرّا ہو تو اسے مضمون قرار دیا جاتا ہے۔ بہ ہر حال مصنف کا ہر مضمون اتنے عمدہ اور معیاری اسلوبِ بیان کا حامل ہے کہ ان تمام ہی پر مقالات کا گمان ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب سرِ ورق پر "مجموعۂ مقالات و مضامین" کے الفاظ لکھتے۔ مصنف نے ویسے بھی اپنے دیباچے میں بعض مضامین کو مقالہ ہی قرار دیا ہے، مثلاً غالب و شبلی کے تعلق سے لکھی گئی تحریر کو مقالہ لکھا ہے۔ اسی طرح علامہ اقبالؒ اور دبستانِ شبلیؒ سے متعلق تحریر کو بھی مقالہ لکھا ہے۔ (ص:۹) نیز "اعظم گڑھ کا شعری منظر نامہ" اور "امتزاجی ادب، چند معروضات" والی تحریرات کو بھی مقالہ قرار دیا ہے۔ (ص:۱۰) بلاشبہ علمی دنیا میں یہ سارے مضامین، مقالات کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک وہ مضامین کہ جنھیں مقالات کہنا بجا، بلکہ زیادہ مناسب ہوگا، یہ ہیں:

۱. علامہ شبلی کا علمی و فکری سرمایہ

❁ ڈین، کلیۂ معارف اسلامیہ، یونی ورسٹی آف کراچی، کراچی

۲. غالب و شبلی
۳. علامہ شبلی کی ملی دردمندی (اردو شاعری کے حوالہ سے)
۴. علامہ اقبال اور دبستانِ شبلی
۵. اقبال احمد خاں سہیل کی غالب شناسی
۶. مولانا ضیاء الدین اصلاحی بطور شبلی شناس

مؤخر الذکر مقالے میں مصنف نے بجائے آخرِ مضمون میں حوالہ دینے کے، درونِ مضمون حوالے دیے ہیں۔ اگر انھیں اندر سے نکال کر باہر شامل کر دیا جائے تو تحقیقِ جدید کی ظاہری ہیئت کے عین مطابق مضمون کی نوعیت بدل جائے گی اور تحقیقِ جدید کے مقلدین اسے مقالہ شمار کر لیں گے۔

کتاب کا انتساب پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شروانی کے نام کیا گیا ہے، جنھیں مصنف نے "بزرگ ادیب، نقاد اور دانشور، جانشین نواب صدر یار جنگ" کے الفاظ سے یاد کیا ہے، اور اپنے دیباچے میں لکھا ہے:

گذشتہ برسوں میں میری جو کتابیں شائع ہوئیں اور ان پر اہلِ علم کی جو آراء آئیں اور جن سے مجھے کچھ سیکھنے اور اپنے علمی سمت و سفر کو جادۂ منزل پر استوار رکھنے میں مدد ملی، ان میں سب سے نمایاں، جانشین صدر یار جنگ، مدیر کانفرنس گزٹ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی کی ذاتِ گرامی ہے۔ "عکس و اثر" کے یہ اوراق انہی کے نام معنون ہیں۔ "گر قبول اُفتد، زہے عزّ و شرف۔ (ص:۱۱)

مصنف نے جو عبارت اپنے دیباچے میں لکھی ہے اگر وہ صفحۂ انتساب (ص:۳) پر تحریر کرتے تو زیادہ نمایاں ہوتی۔ کتاب کا پیش لفظ پروفیسر عبد الستار دلوی نے لکھا ہے جو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی کے ڈائریکٹر تھے۔ مصنف نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے:

ماہرِ لسانیات پروفیسر عبد الستار دلوی اردو کی ایک عظیم شخصیت کا نام ہے۔ کوکن کے اس مایہ ناز سپوت کا شمار ملک کے ممتاز مصنفین میں ہوتا ہے۔ ان کی شفقت مجھے برسوں سے حاصل ہے۔ اس کتاب کا پیشِ لفظ ان ہی کے زرین قلم سے ہے۔ اس کے لئے میں ان کا بیحد ممنون ہوں اور درازئ عمر کی دعاء کرتا ہوں۔ (ص:۱۱)

جس طرح مصنف نے دلوی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، اسی طرح پروفیسر عبد الستار دلوی نے بھی اپنے پیش لفظ میں مصنف کو "ماہرِ شبلیات" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ (ص:۷) اور یہ بھی لکھا ہے۔ "وہ ہمارے عہد کے وسیع المطالعہ ناقدین میں سے ہیں۔" (ص:۷) اس سے مصنف کے علمی و تنقیدی مقام کا کچھ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔

مصنف نے جن محترم ہستیوں کو اپنے دیباچے میں سراہا ہے، ان میں بزرگ ادیب پروفیسر خورشید نعمانی، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، مولانا مجیب اللہ ندویؒ، مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی کے اسماے گرامی شامل ہیں، مولانا ضیاء الحق خیر آبادی کا نام بھی بڑی محبت سے لکھا ہے۔(ص:۱۰-۱۱)

کتاب میں جن شخصیات کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے، ان کے تذکرے سے پہلے ان کی تصاویر میں بھی دی گئی ہیں۔ بلاشبہ شبلی نعمانی، مرزا غالب، علامہ اقبال، اقبال سُہیل، ڈاکٹر ذاکر حسین، فخر الدین علی احمد، ضیاء الدین اصلاحی اور ضیاء الدین اعظمی کی تصاویر نے کتاب کے حسنِ ظاہری میں اضافہ کیا ہے، البتہ نشور واحدی، ڈاکٹر احمر لاہوری اور بدر عالم خاں اعظمی خدا جانے کیوں اس شرف سے محروم رہے۔ماہ نامہ **معارف** کی ادبی خدمات سے قبل، معارف (جولائی ۱۹۱۶ء) کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے۔(ص:۱۷۲)

.....(۱).....

کتاب کا پہلا مقالہ ''علامہ شبلی کا علمی و فکری سرمایہ'' ہے۔ علامہ شبلی کے تعلق سے یہ ایک جامع مقالہ ہے جس میں شبلی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کا تعارف بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے شبلی کی تاریخی تحقیقات کا ذکر کیا گیا ہے، یہ وہ تحقیقات ہیں، جنہیں ''اوّلیات'' کا درجہ حاصل ہے۔ مصنف نے لکھا ہے ''واقعہ یہ ہے کہ تحقیقی مقالہ نگاری کو شبلی نے جو معیار عطا کیا تھا، ہمارا قدم شاید ہی اس سے آگے بڑھا ہو۔ ملک میں اس اسلوب کا عام تتبع ہوا اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔''(ص:۱۵) شبلی کے یہ تحقیقی مقالات آٹھ جلدوں میں موضوعاتی اعتبار سے جمع کر دیے گئے ہیں۔ پہلی جلد، شبلی کے مذہبی علوم، بالخصوص قرآنیات، پر ان کی گہری نظر کا نمونہ ہے۔ یہ مقالات سید سلیمان ندویؒ نے جمع کیے ہیں۔ ان مقالات کی ہر جلد کسی بلند پایہ تصنیف سے کم نہیں ہے۔ اس کے بعد مصنف نے شبلی کی سوانح اور تاریخ نگاری کو اتنے مدلل اور جامع انداز میں لکھا ہے کہ اگر کوئی اس کی تلخیص کرنا چاہے تو شاید نہ کر سکے۔ شبلی کی تنقید نگاری کے ضمن میں مصنف نے لکھا ہے کہ **موازنۂ انیس و دبیر** اور **شعر العجم** کی پانچ جلدیں ان کی تنقید نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔(ص:۱۷) علم الکلام کے تعلق سے لکھا ہے کہ شبلی پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اردو میں کلامی ادب کا آغاز کیا۔(ص:۱۸) نیز مصنف کی یہ عبارت بڑی توجہ طلب ہے، لکھتے ہیں:

> علامہ شبلی نے سلسلۂ کلامیہ ایک خاص مقصد کے لیے شروع کیا تھا۔ وہ علماء کو ایک خاص سطح پر لانا چاہتے تھے۔ اپنے موقف کی حمایت میں انھوں نے عہدِ عباسیہ کے حالات اور علماء کو پیش کیا تھا۔ گو وہ اپنے اس مقصد میں پورے طور پر

کامیاب نہیں ہو سکے، بلکہ اس پر علماء کا ایک گروہ چیں بہ جبیں ہوا، اور بعد میں فتویٰ کفر جاری کیا۔ لیکن یہ حقیقت آج بھی واضح ہے کہ کلام و عقائد پر پھر کبھی اس طرح گفتگو نہ ہو سکی اور جن ضروریات اور حالات کے پیشِ نظر علامہ نے یہ خاکہ تیار کیا تھا وہ عہدِ شبلی ہی کی طرح آج بھی رنگ بھرنے کا منتظر ہے۔ (ص: ۱۸)

علامہ شبلی کی متکلمانہ بصیرت جاننے کے لیے ان کی کتابیں **علم الکلام**، **الکلام**، **الغزالی**، اور **سوانح مولانا روم** پڑھنے کی ضرورت ہے، اور دنیا کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں اب ویسے بھی جدید علمِ کلام کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے اور دنیائے علم ایک بار پھر کسی شبلی کی راہ تک رہی ہے۔ فارسی کے شعر و ادب کے تعلق سے مصنف نے لکھا ہے "شعر العجم نہ صرف اپنے عہد میں بلکہ ایک صدی بعد بھی اپنا جواب نہیں رکھتی اور آج تک خود ایران میں بھی اس پائے کی کتاب نہ لکھی جا سکی۔" (ص:۱۹) شبلی کی مکتوب نگاری بھی خاصے کی چیز ہے۔ اسے بھی سلیمان ندویؒ نے دو حصوں میں جمع کر کے شائع کر دیا تھا۔ ان مکتوبات کو اردو ادب میں خطوطِ غالب کے بعد نمایاں مقام دیا گیا ہے۔ اشاعتِ اسلام میں شبلی کی خدمات، بالخصوص قرآنِ مجید اور اردو کی تعلیم، کے سلسلے میں جابہ جا مکاتب قائم کرنے کا ذکر بھی اس میں موجود ہے۔ (ص:۲۰) اور علامہ شبلی کی سیاسیات، ان کی سیرت نگاری، ان کا اسلوبِ نگارش کے عنوانات سے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے، پھر ان کی شاعری بالخصوص فارسی شاعری کا ذکر ہے، جس کے بارے میں ابو الکلام آزاد نے لکھا ہے۔ "ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ مرزا غالب پر نہیں بلکہ مولانا شبلی پر ہوا۔" (ص:۲۳)

علامہ شبلی، ماہ نامہ **الندوہ**، لکھنؤ اور **محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین** علی گڑھ کے مدیر رہے، اس حیثیت سے ان کی خدمات کا بھی ذکر ہے؛ مصنف نے لکھا ہے: "اس میں علامہ شبلی نے نہ صرف مختلف موضوعات پر مضامین لکھے، بلکہ اردو کے چند نامور ترین اہلِ قلم کی تصنیف و تالیف کے لیے تربیت بھی کی، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا عبد السلام ندوی کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔" (ص:۲۳)

اس مقالے کا آخری ذیلی عنوان "انجمن ترقیٔ اردو" ہے۔ اردو کی ترقی میں شبلی نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس میں ان کا ذکر ہے۔ علامہ شبلی کے علمی و فکری سرمائے کا یہ اجمالی تعارف بہ حیثیت مجموعی بہت جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

..... (۲) .....

کتاب کا دوسرا مقالہ "غالب و شبلی" کے عنوان سے ہے۔ یہ بھی بہت وقیع اور جامع مقالہ ہے۔ اس میں شبلی اور غالب کے مابین بعض اشتراکات کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے، اور اس تاثر کو رفع کیا گیا ہے، جو شبلی کے منکرِ

غالب ہونے کا شعیب اعظمی اور مولوی عبد الحق کی جانب سے پیدا کیا گیا۔(ص:۳۱) اس میں شبلی کی شاعری، بالخصوص فارسی شاعری، کے مرزا غالب کی فارسی شاعری سے قدرے ہم آہنگ ہونے کی جھلک پیش کی گئی ہے؛ اس ضمن میں لکھا گیا ہے:''غالب کی فارسی شاعری کی عظمت کا اعتراف نقادوں نے یہ لکھ کر کیا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ مرزا غالب پر ہوا، لیکن ابو الکلام آزاد کا خیال ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ غالب پر نہیں شبلی پر ہوا۔'' (ص:۲۹)

مصنف نے یہ بھی لکھا ہے:

وہ اردو کے ایک بڑے قادر الکلام اور خوش فکر شاعر تھے۔ ان کا اردو فارسی دیوان موجود ہے، جس میں مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، نظم، قطعات، رباعیات، مخمس، اور ترکیب بند سب کچھ موجود ہے۔ ان کی یہ تخلیقات معیار و وقار کے لحاظ سے بھی کم رتبے نہیں۔ اردو میں تاریخی اور اخلاقی نظم نگاری ان ہی کے ذہن رسا کی ایجاد و اختراع ہے۔ اور اس میدان میں ان کے عہد میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔(ص:۲۸)

شبلی کی شاعرانہ عظمت اور اثر آفرینی کا اعتراف الطاف حسین حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کے حوالوں سے بھی بیان کیا گیا ہے۔(ص:۲۷-۲۸) مقالے میں غالب و شبلی کے مابین ایک اشتراک، تاریخ نگار کی حیثیت سے بھی تلاش کیا گیا ہے۔ شبلی کی تاریخ نگاری تو مسلم ہے، مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ غالب بھی مؤرخ تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے حکم پر تیموریوں کی تاریخ مہر نیمروز لکھی تھی۔ گو ان کی شاعری کی شہرت نے ان کی مؤرخانہ حیثیت کو گہنا دیا، بالکل اسی طرح جس طرح شبلی کی شاعری کو ان کی مؤرخانہ اور عالمانہ حیثیت نے متاثر کیا۔

''غالب و شبلی'' میں دونوں بزرگ ہستیوں کی خطوط نگاری کو بھی موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ ''خطوطِ غالب'' اردو ادب کا ناقابلِ فراموش باب ہے؛مصنف نے لکھا ہے: ''غالب کے خطوط سے شبلی کے خطوط تک نثری ادب نے ارتقاء کی جو منزلیں طے کی ہیں۔ ان کی آواز بازگشت بھی شبلی کے خطوط میں سنائی دیتی ہے۔ دراصل شبلی کے خطوط، غالب کی مکتوب نگاری کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔'' (ص:۳۵)

مصنف نے شبلی کے خطوط میں غالب کے اثر کو ایک مثال سے بھی نمایاں کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ ''کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، غالب کے خطوط سامنے رکھ کر شبلی نے خط لکھا ہے۔'' (ص:۳۶) مصنف کے یہ قول:

شبلی، دیوانِ غالب کو دل سے پسند کرتے تھے۔ ان کے قصائد، غزلیات، اور خاص طور سے ان کی مکتوب نگاری کے بڑے مداح تھے، لیکن ایک نقاد کی حیثیت سے شبلی نے بعض تنقیدیں بھی کی ہیں جن پر بحث و تحقیق ہو سکتی ہے، تاہم شبلی کو منکرِ غالب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ (ص:۳۱)

شبلی نے امیر خسرو کا سعدی شیرازی کے ایک شعر سے موازنہ کر کے امیر خسرو کی برتری دکھلائی ہے اور پھر خسرو کی اس برتری پر غالب کی برتری ثابت کی ہے اور غالب کا یہ شعر

نظر کہیں نہ لگے ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

نقل کر کے لکھا ہے کہ غالب نے اسے اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے۔ (ص:۳۲)

مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اکثر نقادوں کی طرح شبلی بھی غالب کی ایک بڑی خوبی، یعنی ان کے فلسفۂ شاعری کے قائل اور قدر دان تھے۔ (ص:۳۲) مختصر یہ کہ اس مقالے میں شبلی کی غالب شناسی، مکتوب نگاری میں ان کا تتبع اور فلسفیانہ شاعری کے اعتراف کے ساتھ ساتھ بعض تنقیدات بھی کی گئی ہیں۔ بہ ہر حال اپنے عنوان پر یہ ایک عمدہ اور جامع مقالہ ہے۔

.....(۳).....

تیسرا مقالہ "علامہ شبلی کی ملّی درد مندی (اردو شاعری کے حوالہ سے)" ہے۔ شبلی نعمانی، علامہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو فارسی کے شاعر بھی تھے؛ گو ان کی شاعری بہت مختصر ہے مگر بامقصد ہے، ان کے کلیات ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہیں۔ (ص:۴۱) بہ قول مولانا سید سلیمان ندویؒ: "مولانا (شبلی) نے تاریخی اور اخلاقی نظموں کے دو الگ الگ سلسلے شروع کیے، جن میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اردو کے بڑے بڑے ضخیم دیوانوں کے مقابلے میں بھاری ہے۔" (ص:۴۲) ان کی بعض نظموں کے عنوانات یہ ہیں: ہجرتِ نبویؐ، اہلِ بیتِ رسول کی زندگی، ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر، مساواتِ اسلام، عدلِ فاروقی کا نمونہ، جرأت و صداقت، ہمارا طرزِ حکومت، عدلِ جہانگیری، خلیفہ عمر بن عبد العزیز کا انصاف وغیرہ۔ (ص:۴۲) ان کی شاعری کی بابت ڈپٹی نذیر احمد کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے:

تم اپنی نثر کو لو، نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

(ص:۴۲)

اس مقالے میں شبلی کی درد مندی کے تعلق سے ان کی ایک نظم کو، جو جنگِ طرابلس کے زمانے میں، "شہر آشوبِ اسلام" کے نام سے لکھی گئی تھی، حوالے میں پیش کیا گیا ہے؛ بلاشبہ یہ ایک متاثر کن نظم ہے۔ یہ نظم

رفاہِ عام لکھنؤ کے اجلاسِ عام میں پڑھی گئی تھی، جب یہ پڑھی گئی تھی تو کہا جاتا ہے کہ جلسے میں ہر طرف ماتم برپا ہو گیا تھا؛ اس کے درج ذیل اشعار مقالے میں لکھے گئے ہیں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھّے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے ٹکڑے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ خستہ جاں کب تک
یہ سیلابِ بلا، بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہو گا اس کا امتحان کب تک
یہ مانا گرمیٔ محفل کا ساماں چاہیے تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
زوالِ دولتِ عثماں، زوالِ شرعِ ملّت ہے
عزیز و فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں!
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگِ اذاں کب تک
کہیں اڑ کر یہ دامانِ حرم کو بھی نہ چھو آئیں
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک
(ص:۴۳-۴۴)

اسی طرح ۱۹۱۲ء میں مچھلی بازار کان پور کی مسجد کے وضو خانے کے انہدام پر انھوں نے جو نظم لکھی تھی، وہ بھی مولانا کی درد مندی کی عکاس ہے۔ مقالے میں اس نظم کے بعض اشعار کوٹ (Quote) کیے گئے ہیں۔(ص:۴۶) بلقان کے مسلمانوں کی شہادت کا مرثیہ بھی علامہ شبلی کے ہاں موجود ہے۔ انھوں نے جنگِ عظیم اوّل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی نظم " جنگِ یورپ اور ہندوستانی" (ص:۴۷) ایک ایسی نظم تھی جس پر انھیں گرفتار کرنے کا فیصلہ ہوا، مگر انگریز انھیں گرفتار نہ کر سکے؛ کیوں کہ وہ گرفتاری کے رُوبہ عمل ہونے سے پہلے ہی اپنے رب کی حضوری میں پہنچ چکے تھے۔ اگر ان کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو یقیناً گرفتاری کا اعزاز ضرور حاصل کرتے۔

.....(۴).....

کتاب کا چوتھا مقالہ "علامہ اقبال اور دبستانِ شبلی" کے عنوان سے لکھا گیا ہے، کتاب کا سب سے مفصل مقالہ بھی یہی ہے۔ دبستانِ شبلی سے بہ راہِ راست وابستہ جن علما کے اسمائے گرامی اس مقالے میں درج ہیں، وہ یہ ہیں: حمید الدین فراہیؒ، سید سلیمان ندویؒ، اقبال احمد خاں سہیلؒ، مسعود علی ندویؒ، مولوی شبلی متکلم، ضیاء الحسن ندویؒ اور عبد الرحمٰن نگرامی۔ مصنف کے بہ قول یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے فکرِ شبلی کو عمر بھر سینے سے لگائے رکھا۔ (ص:۵۰) پھر وہ مشاہیر جنھوں نے علامہ شبلی سے استفادہ کیا، ان میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، ابو الکلام آزاد، عبد الماجد دریابادی، حبیب الرحمٰن خان شروانی، حسرت موہانی، خواجہ غلام الثقلین،

خوشی محمد ناظر، سجاد حیدر یلدرم اور باباے اردو، مولوی عبدالحق کے نام شامل ہیں اور انھی ناموں میں ایک بہت بڑا نام علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا بھی آتا ہے۔

شبلی نعمانی نے ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب، **علم الاقتصاد** کے بعض حصوں کے زبان و بیان کی تصحیح خود ان کی خواہش پر کی تھی۔(ص:۵۲) علامہ اقبال کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے: *The Development of Metaphysics in Persia* میں علامہ شبلی کی دو کتابوں **الغزالی** اور **علم الکلام** کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۰۷ء میں لکھا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بھی شبلی کے مستفیدین میں رہے ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ مقالہ اردو میں **فلسفۂ عجم** اور فارسی میں **سیر فلسفہ در ایران** کے ناموں سے شائع ہوا، اس طرح علامہ اقبال کی معرفت جرمن اور ایرانی اہلِ علم، شبلی سے پہلی بار متعارف ہوئے۔(ص:۵۲)

علامہ شبلی نے انجمن ترقیٔ اردو کے پہلے سیکریٹری کی حیثیت سے اردو کتابوں کے ترجمے کا کام شروع کروایا۔ اس ضمن میں انھوں نے **فلسفۂ تعلیم**، جس کا ترجمہ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے کیا تھا، چھپوانے سے پہلے جن چار اہلِ علم کو بہ طور پارکھ (Refree) منتخب کیا تھا، ان میں ایک نام علامہ اقبال کا بھی تھا، جن کی مثبت رپورٹ کے بعد ہی کتاب چھاپی گئی تھی۔(ص:۵۳)

ظہور الدین مہجور نے کشمیر کے شعراے فارسی کا تذکرہ لکھنے کا ذکر جب علامہ اقبال سے کیا تو انھوں نے فرمایا: ''یہ تذکرہ ضرور لکھیے، مگر صرف حروفِ تہجی کے اعتبار سے نہ لکھیے گا، بلکہ **شعر العجم** کی طرح شعراء فارسی کی شاعری کا ناقدانہ جائزہ ہونا چاہیے۔''(ص:۵۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے شبلی کی **شعر العجم** کا مطالعہ کیا تھا اور وہ **شعر العجم** کی تنقیدات کے مداح بھی تھے، تبھی تو ایسا مشورہ دیا۔

شبلی و اقبال کی باہم ملاقات ۱۹۱۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں ہوئی تھی، اس موقع پر شبلی نے اقبال کے گلے میں ہار بھی ڈالے تھے اور اپنی تقریر میں اقبال کو غالبِ ثانی ہونے کی نوید بھی دی تھی۔(ص:۵۴) ۱۹۱۲ء میں شبلی نے وقف علی الاولاد کے لیے قانون سازی کی تحریک چلائی اور اس ضمن میں وائسرائے سے ملاقات کے لیے جو وفد تجویز ہوا تو انھوں نے اس وفد میں علامہ اقبال کو بھی شامل کیا۔ یہ امر دیگر ہے کہ اقبال نے بہ وجوہ اس میں شمولیت سے معذرت نامہ بھیج دیا۔(ص:۵۵)

ڈاکٹر سید افتخار حسین شاہ نے شبلی و اقبال کی سوانح حیات اور فکر و فن میں مشترک قدروں کے تعلق سے جو لکھا ہے، اسے مصنف نے اپنے مقالے میں بھی جگہ دی ہے اور ان دونوں محترم ہستیوں کے مابین مشترک اقدار کو نمایاں کر کے لکھا گیا ہے۔ یہ مشترک قدریں تعداد میں بیس ہیں۔(ص:۵۷۔۵۸) مگر یہ وہ قدریں ہیں جو بہت

عام سی ہیں اور دیگر لوگوں میں ان کا پایا جانا بھی اسی طرح ممکن ہے جس طرح ان دونوں میں دکھایا گیا ہے۔ تبصرہ نگار کے خیال میں مصنف نے جن چیزوں کو مشترک قدر کے طور پر ڈاکٹر افتخار کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے، وہ "قدر" ہیں ہی نہیں، مثلاً ۱- دونوں کے بزرگ تصوف سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ۲-دونوں کی ابتدائی تعلیم دینی مدارس میں ہوئی۔ ۳- شوقِ تعلیم اس قدر تھا کہ آبائی وطن سے دور جاکر دوسرے شہروں میں تعلیم حاصل کی وغیرہ؛ بھلا یہ بھی کوئی اقدار ہیں؟ مصنف اگر شبلی و اقبال کے مابین کچھ اصولی اختلافات کا ذکر کرتے تو زیادہ دل چسپ اور مناسب ہوتا اور نئی جہتیں سامنے آتیں، مثلاً علامہ اقبال دو قومی نظریے کے زبردست حامی تھے اور شبلی نعمانی اس کے سخت مخالف، جیسا کہ مصنف نے خود لکھا ہے: "شبلی کانگریس کے حامی، دو قومی نظریہ کے مخالف اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔"(ص:۴۸) اس لیے مصنف کا یہ جملہ محلِ نظر ہے: "اقبال کا نظریۂ سیاست بھی شبلی کے فکر و نظر کا پرتو ہے۔" (ص:۶۵)

علامہ اقبال نے "حالی اور شبلی" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے، جو ان کے مجموعۂ کلام **بانگِ درا** میں موجود ہے۔ یہ نظم ان دونوں بزرگوں کے سانحۂ ارتحال پر لکھی گئی تھی، کیوں کہ دونوں کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا تھا، اس نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

شبلی نعمانی نے دارالمصنفین (علی گڑھ) ۱۹۱۴ء میں قائم کیا اور اسی سال وہ راہیِ ملک عدم ہوئے تھے، مگر اقبال نے اس ادارے سے اپنی وابستگی عمر بھر رکھی، وہ دارالمصنفین کی مجلسِ انتظامیہ کے تا حیات رکن رہے۔(ص:۶۶)

دبستانِ شبلی میں سید سلیمان ندویؒ کا نام سب سے پہلے آتا ہے، خود اقبال کو بھی اس کا ادراک تھا، انھوں نے سید صاحب سے خود اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: "مولانا شبلی کے بعد آپ استاذ الکل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہو گا۔"(ص:۶۸)

اقبال نامہ (مرتبہ: شیخ عطاء اللہ) میں علامہ اقبال کے ستر خطوط سید صاحب کے نام ملتے ہیں، ان خطوط سے اقبال کی سید صاحب سے محبتِ علمی کا پتہ چلتا ہے؛ علامہ اقبال نے سید صاحب کے بارے میں لکھا ہے: "آج سید سلیمان ندوی ہماری زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس

المصنفین ہیں۔ ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔"(ص:۸۶)

سیرتِ عائشہ کے بارے میں اقبال نے لکھا:" اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔" (ص:۶۹) اسی طرح **عمر خیام** کے بارے میں لکھا ہے کہ " **عمر خیام** پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔" (ص:۶۹) یہی معاملہ سید صاحب کا اقبال کے ساتھ تھا، ماہ نامہ **معارف** کے متعدد شذرات میں سید صاحب نے اقبال کا ذکر ان کی زندگی ہی میں کیا، **رموزِ بے خودی** کا تعارف و تجزیہ سب سے پہلے انھیں کے قلم سے نکلا۔"(ص:۶۸)انھوں نے اقبال سے متعلق انگریزی مضامین کے ترجمے بھی شائع کیے، جسے اقبال نے بے حد پسند کیا۔(ص:۶۹) اقبال کی وفات پر سید صاحب نے جو مضمون لکھا، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے؛ انھوں نے لکھا:" اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یاد رہیں گی، ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، نظریے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اس کی دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرت سے ان کا مقابلہ ہوگا۔"(ص:۷۰)

سید صاحب کی پیش گوئی واقعہ بن گئی۔ اقبال کی تصنیفات پر جتنا کام ہوا ہے برصغیر کے کسی شاعر، دانش ور، عالم اور فلسفی کے حصے میں نہیں آیا۔ قرآن پاک کی آیتوں کے تعلق سے ۱۱۱۸ صفحات پر مشتمل کتاب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خانؒ نے تحریر کی ہے۔ (یہ کتاب ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۱ء تک اقبالیات پر شائع ہونے والی پاکستان کی بہترین کتاب قرار دی گئی، اور مصنف کو پہلا قومی صدارتی اقبال ایوارڈ دیا گیا۔) اسی طرح احادیث شریفہ کے جملوں کے تعلق سے ڈاکٹر محمد عبد المقیت شاکر علیمی کی ۹۲۰ صفحات پر مشتمل کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ (اسے مکتبۂ علیمی گلشن اقبال، کراچی سے ۲۰۱۳ء میں شائع کیا گیا ہے۔) یہ صرف دو مثالیں ہیں، وگرنہ اقبال پر ہونے والے کاموں کا تنوع اب خود ایک علمی و تحقیقی موضوع بن چکا ہے۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ڈاکٹر الیاس اعظمی نے ص:۶۸ پر لکھا ہے۔ "**رموزِ بے خودی** کا تعارف و تجزیہ سب سے پہلے انھیں کے قلم سے نکلا ہے اور اگلے صفحے، ۶۹ پر اسی بات کا اعادہ ان لفظوں میں کیا ہے۔ "**رموزِ بے خودی** پر تبصرہ کیا۔" اتنے بلند پایہ مقالے میں اس طرح کے تکرار سے احتراز مناسب تھا۔

سید سلیمان ندوی کے بعد "علامہ اقبال اور دبستانِ شبلی" میں مولانا عبد السلام ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبد الرحمن اور یحییٰ اعظمی کا ذکر کیا گیا ہے اور ان چاروں شخصیات کا علامہ اقبال سے عقیدت و محبت کا رشتہ ان کے افکار و اشعار سے ظاہر کیا گیا ہے۔

اقبال اور عبد السلام ندوی کے ذیل میں مصنف نے اقبال کے اُس خط کو نقل کیا ہے، جس میں انھوں نے سلیمان ندوی کو لکھا تھا:

> اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہِ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اس مبحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی، جو میری نظر سے گزری ہے مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے، مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔ (ص:۷۳)

اسی طرح کے ایک اور خط کا بھی حوالہ دیا گیا ہے: "دارالمصنفین کی طرف سے ہندوستان کے حکمائے اسلام پر ایک کتاب نکلنی چاہیے، اس کی سخت ضرورت ہے۔ عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں۔" (ص:۷۴)

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ " سید صاحب نے یہ کتابیں تو نہیں لکھیں، البتہ مولانا عبد السلام ندوی کے قلم سے ان دونوں موضوعات پر کتابیں نکلیں۔" (ص:۷۴) مگر سچ یہ ہے کہ انھوں نے **حکمائے اسلام** کے نام سے تو بے شک دو جلدوں پر مشتمل کتابیں لکھیں، مگر فقہِ اسلامی پر وہ کوئی کتاب خود نہیں لکھ سکے، تاہم انھوں نے محمد خضری بک کی کتاب **تاريخ التشريع الإسلامي** کا اردو ترجمہ کر دیا اور کتاب لکھنے اور ترجمہ کرنے میں جو فرق ہے، وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔

اس مقالے کا آخری عنوان "اقبال اور ماہنامہ معارف" ہے۔ اس مضمون میں اقبال کا **معارف** اعظم گڑھ سے دیرینہ اور گہرا تعلق ثابت کیا گیا ہے اور خوب دادِ تحقیق دی گئی ہے۔ اقبال کے "ماہ نامہ **معارف**" میں چھپنے والے کلام اور الگ سے شائع ہونے والے کلام، دونوں کو باریک بینی سے دیکھا گیا ہے، پھر دونوں جگہوں کے معمولی اختلافات پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس سے مصنف کے ذوقِ تحقیق کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔ (دیکھیے ص:۸۲-۸۳)

اقبال کے تعلق سے **معارف** میں شائع ہونے والے مقالات و مضامین مع عنوانات کے بھی رقم کیے گئے ہیں، جن کی تعداد ۱۶۰ ہے۔ (ص:۹۲) اقبال کے تعلق سے جو کتابیں لکھی گئیں یا رسالوں کے نمبر شائع ہوئے اور ان پر **معارف** نے جو تبصرے کیے، ان سب کا اس مقالے میں ذکر ہے، ان تبصروں کی تعداد ۹۴ ہے۔ (ص:۹۷) علامہ

اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر و فن پر متعدد شعرا کی نظمیں بھی ماہ نامہ معارف میں شائع ہوتی رہی ہیں، ان کا اشاریہ بھی شاملِ مقالہ ہے۔(ص:۹۸)

مصنف کی یہ عبارت لائقِ توجہ ہے:

دبستانِ شبلی کے اہلِ قلم نے فکر و نظر کی ہم آہنگی کے سبب اقبال کو ہمیشہ اپنا خیال کیا اور بانی دارالمصنفین سے نظریاتی ہم آہنگی کی وجہ سے علامہ اقبال ان کے شیدائی رہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو علامہ اقبال دبستانِ شبلی ہی کے ایک فرد معلوم ہوتے ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے علامہ شبلی کو سرسید تحریک کے ردِ عمل کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ اگر یہ سچ ہے تو اقبال اس ردِ عمل کا اصل نتیجہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔(ص:۹۸)

(۵).....

پانچواں مقالہ "اقبال سہیل کی غالب شناسی" کے موضوع پر ہے۔ بہ قول مصنف: "اقبال سہیل، علامہ شبلی کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ شبلی کے شعر و ادب کی وراثت ان کے حصہ میں زیادہ آئی تھی، جس پر انھیں بجا طور پر ناز تھا۔" (ص:۱۰۲) اقبال سہیل، غالب کے مداح نہیں قصیدہ خواں تھے، وہ غالب پر کسی کی تنقید برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ مگر اس عقیدت اور جذباتی وابستگی کے باوجود بعض مقامات پر انھوں نے خود مرزا غالب پر تنقید بھی کی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ مرزا غالب کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی چند غزلیں بھی نقصِ معنوی سے پاک نہیں ہیں۔ (ص:۱۰۹) مگر ایک مقام پر اقبال سہیل کی تنقید، راقم الحروف کو صحیح معلوم نہیں ہوئی؛ پہلے ان کی تنقید دیکھیے، بعد میں میری ناچیز رائے ملاحظہ کیجیے:

غالب کا یہ شعر:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں !

اگر کسی مہذب زبان میں ترجمہ کیا جائے تو غالباً یہ بات کسی کے سمجھ میں نہ آسکے گی کہ انسانی تمدن اس قدر پست بھی ہو سکتا ہے اور دنیا کے کسی حصہ میں انسانوں کی ایک ایسی سوسائٹی بھی تھی جس میں نوحہ گری بطور پیشہ اختیار کی جاتی تھی اور اُمراء کے عشرت کدوں میں رنج و الم کے موقع پر مصنوعی اظہارِ غم کے لیے ان پیشہ ور نوحہ گروں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔(ص:۱۰۸)

مرزا غالب کے شعر پر اقبال سہیل کا یہ تجزیہ، کہ انسانی تمدن اس قدر پست بھی ہو سکتا ہے، قطعاً غیر مناسب ہے۔ تاریخ بالخصوص اسلامی تاریخ کے طلبہ اس امر سے بہ خوبی واقف ہیں کہ عرب سوسائٹی ایسے ہی انسانوں پر مشتمل تھی، جن کا تذکرہ غالب کے شعر میں ہے۔ غزوۂ بدر میں اپنے مقتولین کا بدلہ لینے کے لیے ہندہ

نے پیشہ ور نوحہ گروں سے اپنے مکان میں ماتم کروایا تھا۔ غالب نے اپنے شعر میں جو کچھ کہا ہے، وہ پست خیالی نہیں بلکہ امر واقعہ تخییل ہے؛ یہ مقامِ داد ہے نہ کہ موقع تنقید۔

.....(۶).....

کتاب کا چھٹا مضمون " ڈاکٹر ذاکر حسین اور اردو" کے موضوع پر ہے۔ مضمون میں ڈاکٹر ذاکر کا مختصر سوانحی خاکہ بھی درج ہے۔ ذاکر حسین، اردو، انگریزی اور جرمن زبانوں کے ماہر تھے۔ مترجم کی حیثیت سے انھوں نے نو مضامین اور تین کتابوں کو اردو میں منتقل کیا جن میں بیشتر تحریریں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئیں، البتہ ایک کتاب جرمن سے بھی اردو میں ترجمہ کی گئی۔ انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے اپنا مقالہ جرمن زبان میں، برلن (جرمنی) یونی ورسٹی میں لکھا تھا۔ ڈاکٹر الیاس اعظمی نے لکھا ہے کہ ۱۹۱۵ء میں ۱۸ سال کی عمر میں انھوں نے، جب وہ علی گڑھ میں طالب علم تھے، پروفیسر براؤن کی کتاب کے ایک مضمون کا "بابی مذہب" کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ اردو میں ان کی یہ پہلی تحریر تھی۔ اسی صفحے پر اگلے پیراگراف میں لکھا ہے: "مسٹر کنن کی مشہور کتاب **ایلی مینٹری پولیٹیکل اکانمی** کا ترجمہ **مبادیِ معاشیات** کے نام سے کیا، یہ ذاکر صاحب کی پہلی اردو کاوش تھی۔" ان دونوں عبارتوں میں مصنف نے دو الگ الگ اردو ترجموں کو ان کی پہلی اردو تحریر یا کاوش ظاہر کیا ہے، جو بدیہی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے؛ تاہم مصنف کے ادبی مقام کے پیشِ نظر ان ہر دو متضاد عبارتوں میں تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ ۱۸ سال کی عمر میں انھوں نے ایک مضمون کو پہلی بار اردو میں ترجمہ کیا اور بعد میں ایک مکمل کتاب کو؛ اس طرح ان کا دعوائے اولیت اپنے اپنے مقام پر درست ہو جائے گا۔

ذاکر صاحب انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے آٹھ برس تک صدر رہے اور اردو کے تحفظ و بقا کے لیے قابلِ قدر کوششیں کیں۔ (ص:۱۲۰) ملک کے مایہ ناز تصنیفی ادارے دارالمصنفین شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) سے بھی ان کا بڑا جذباتی تعلق تھا۔ وہ اس کی مجلسِ انتظامیہ میں رہے اور یہاں بھی بڑا نمایاں کردار ادا کیا؛ مصنف نے لکھا ہے۔ " انھیں کی سرپرستی میں فروری ۱۹۶۵ء میں اس کی جبلی منائی گئی۔ (ص:۱۲۱) جبلی سے مصنف کی مراد یقیناً جوبلی (Jubilee) ہے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہ کونسی جوبلی تھی؟ سلور یا گولڈن؟ اسے بھی یہاں مذکور ہونا چاہیے تھا، صرف جوبلی لکھنا کافی نہ تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے بچوں کے لیے اخلاقی و تہذیبی کہانیاں بھی لکھیں، مصنف نے لکھا ہے: " اردو میں کہانیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے لیکن افادیت کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کی کہانیاں آج بھی اپنا جواب نہیں رکھتی ہیں۔" (ص:۱۲۱)

.....(۷).....

کتاب کا ساتواں مضمون ''فخر الدین علی احمد (ایک عہد ساز شخصیت)'' کے عنوان سے ہے۔ فخر الدین علی احمد، جمہوریۂ ہند کے سابق صدر رہے۔ ان کی مدتِ صدارت ۲۴/ اگست ۱۹۷۴ء سے شروع ہوئی اور ان کی وفات (۱۱/ فروری ۱۹۷۷ء) تک رہی۔ اس سے پہلے وہ متعدد مرتبہ منصبِ وزارت پر فائز رہے۔ آزادی سے پہلے بھی وہ آسام کے وزیر اور اس کے بعد آسام ہی کے ایڈوکیٹ جنرل ہوئے، پھر آزادی کے بعد وہ مالیات، پنچایت، زراعت، صنعت، اور کمیونٹی ترقی کے محکموں کے وزیر رہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی حکومت میں بھی توانائی و آب پاشی کے وزیر رہے، غرض مختلف حکومتوں میں وہ تعلیم، صنعت، کمپنی معاملات اور وقف کی وزارتوں کے حامل ہوئے۔ غذا کا قلم دان بھی ان کے پاس آیا اور آخر میں ملک کا سب سے بڑا عہدہ بھی ان کے ہاتھ آیا۔ ان تمام ذمے داریوں کو وہ بہ حسن وخوبی ادا کرتے رہے، وہ مسلمانوں کی عمدہ پہچان بن کر چمکے، وہ ایک دل آویز شخصیت کے مالک تھے؛ مصنف کے بہ قول: ''اقلیتوں کے مسائل، سرکاری ملازمتوں میں ان کی مناسب حصہ داری، پولیس، پی اے سی میں صحیح نمائندگی، مسلم یونیورسٹی اور دیگر اقلیتی اداروں کے اقلیتی کردار جیسے اہم مسائل سے بھی انھوں نے دلچسپی لی اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے کوششیں کیں۔'' (ص:۱۲۷) ''ایوانِ غالب، غالب آڈیٹوریم، میوزیم، لائبریری، غالب انسٹی ٹیوٹ اور ان کی عمارتیں دراصل انھیں کی ذاتی دلچسپیوں کی یادگاریں ہیں... آج ملک میں اردو اکادمیوں کا جو جال بچھا ہوا ہے اور جن کی بدولت اردو زبان و ادب کے گوناگوں کام انجام پا رہے ہیں، ان کے قیام میں بھی ان کی ذاتی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔'' (ص:۱۲۸)

.....(۸).....

کتاب کا آٹھواں مضمون ''نشور واحدی'' پر ہے۔ نشور، فطری و وہبی شاعر تھے، الشعراء تلامیذ الرحمٰن کا اطلاق انھی جیسے شعرا پر کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی سخن وری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے، خود ہی کہا اور خود ہی اصلاح کی۔ ان کا پہلا دیوان، صہبائے ہند، ستائیس سال کی عمر میں شائع ہوا، مصنف کے بہ قول: ''ان کی پہلی تخلیقی کاوش صہبائے ہند ۱۹۳۹ء میں منظرِ عام پر آئی، جو ایک مفکرانہ کوشش تھی۔ اس میں نشور صاحب مفکر شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو جام رومی سے لبریز مثنوی، فکرِ اقبال کی توسیع تھی۔'' (ص:۱۲۹)

نشور واحدی کی تخلیقات وتصنیفات پر مصنف کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

صہبائے ہند ان کی پہلی کاوش تھی اس سے ان کی اٹھان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد متعدد منظوم و منثور تخلیقات نے ان کی شاعرانہ عظمت، انفرادیت اور بلند پائیگی کا لافانی نقش قائم کیا۔ **شور نشور** (۱۹۴۲ء) **آتش و نم** (۱۹۴۶ء) **فروغِ جام** (۱۹۵۷ء) **دانش آخر الزمان** (۱۹۶۶ء) **سوادِ منزل** (۱۹۶۸ء) **گل افشانیٔ گفتار** (۱۹۷۷ء) **تاریخ فلسفۂ خودی** (۱۹۷۹ء) **اشک چکاں سے عصر رواں تک** (۲۰۰۰ء) وغیرہ۔ اقلیم شعر و ادب پر ان کی کشور کشائی کے ایسے نمونے ہیں جو انھیں بقائے دوام کی دولت عطا کرتے ہیں۔

ان کی نثری کاوشیں، **دانش آخر الزماں** (۱۹۶۶ء) **تاریخ فلسفۂ خودی** (۱۹۷۹ء) **ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقاء** (۱۹۹۲ء) اور **رمز معانی** (۲۰۰۸ء) نہ صرف ان کے گہرے ادبی تاریخی اور فلسفیانہ شعور اور وسیع النظری کا نمونہ ہیں، بلکہ اپنے موضوع پر معرکتہ الآراء تصانیف بھی ہیں۔ (ص:۱۳۱)

مصنف کی مذکورہ بالا عبارت نے ان کے سنجیدہ قارئین کو خلطِ مبحث میں مبتلا کر دیا ہے۔ انھیں نشور صاحب کی منظوم اور منثور تخلیقات کو الگ الگ کر کے لکھنا چاہیے تھا۔ اب دیکھیے: انھوں نے **دانشِ آخر الزماں** اور **تاریخ فلسفۂ خودی** کا ذکر پہلے پیرا گراف میں بھی کیا ہے اور متصل پیرا گراف میں انھی کتابوں کو پھر نثری تخلیقات کے ذیل میں بھی ذکر کر دیا ہے، کیا یہ تکرار صحیح ہے؟

اسی طرح ان کی ایک عبارت اور ملاحظہ کیجیے: "...یہی وجہ ہے کہ نشور واحدی کی "گل افشانیٔ گفتار" مثالی قرار پائی اور ان کے "عزمِ محکم" نے "سوادِ منزل" تک پہنچایا اور یہی وہ منزل ہے، جہاں واحدی صاحب اشکِ چکاں کے بعد پہنچے اور ان کے ممتاز معاصرین نہ پہنچ سکے۔" (ص:۱۳۱)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نشور صاحب کی ایک تخلیق "عزمِ محکم" نام کی بھی ہے۔ مگر مصنف نے تخلیقات کے ذیل میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر یہاں جس انداز میں عبارت آرائی کی گئی ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ "عزمِ محکم" بھی ان کی تصنیف ہے، مگر منظوم اور منثور تخلیقات میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

مصنف نے لکھا ہے:

> مولانا سید سلیمان ندویؒ اور اقبال احمد خاں سہیل ان کے بڑے مداح و قدر دان تھے۔ سید صاحب ان کی تخلیقات "شور نشور" کے عنوان سے ماہ نامہ **معارف** میں نہایت اہتمام سے شائع کرتے تھے۔" (ص:۱۳۲) "نشور صاحب اردو شاعری کے حافظ شیرازی تھے۔ ان کے تغزل کی رنگینی و دلکشی ان کے ممتاز معاصرین سے مختلف ہے۔ سوز و گداز، درد و تڑپ اور ہجر و فراق میں بھی وہ وہی طرز و ادا جو فارسی شعراء میں متاثرین کا وصفِ خاص تھا، استعمال کرتے ہیں لیکن یہ فضا وہ بالقصد نہیں تیار کرتے بلکہ وہ ان کے دل و دماغ اور ذوق و وجدان میں رچی بسی تھی۔ ان کی یہ شاعرانہ خوبیاں انھیں ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ (ص:۱۳۸)

.....(۹).....

کتاب کا نواں مقالہ ''مولانا ضیاء الدین اصلاحی، بطور شبلی شناس'' کے عنوان سے ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی بنیادی طور پر مدرسۃ الاصلاح کے فرزند ہیں۔ مدرسۃ الاصلاح بھی تعلیمی پہلو سے مولانا شبلی کے حلقۂ افکار کا مدرسہ مانا جاتا ہے۔ ضیاء الدین اصلاحی صاحب اسی مدرسے سے فارغ ہو کر ۱۹۵۶ء میں دارالمصنفین کے رفیق منتخب ہوئے اور فکرِ شبلی کے حامل اور ترجمان بن گئے۔ اسی سبب سے ۱۹۸۸ء میں انھیں ادارے کا ناظم اور ماہ نامہ معارف کا مدیر مقرر کیا گیا۔ وہ دم واپسیں تک اس سے منسلک رہے۔ مصنف نے انھیں تاریخ دارالمصنفین کا اکبر اعظم قرار دیا ہے۔ (ص:۱۴۰) ان کے کریڈٹ پر تقریباً ایک درجن کتب، متعدد مقالات، دو سو سے زائد وفیات، ڈھائی سو کے قریب شذرات، ہزاروں کتابوں پر نقد و تبصرے اور متعدد کتابوں پر مقدمے اور دیباچے موجود ہیں۔ (ص:۱۴۰)

ڈاکٹر الیاس اعظمی کے بہ قول: ''انھوں نے شبلی، تصانیفِ شبلی اور افکارِ شبلی کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا، جس پر ان کی تحریریں شاہد ہیں۔ انھوں نے شبلی کی تصنیفات اور ان کے افکار و خیالات اور ان کے اسلوب و خصوصیات پر متعدد مضامین و مقالات لکھے، ان کا آخری طویل مقالہ بھی علامہ شبلی نعمانی سے متعلق ہے۔'' (ص:۱۴۱)

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ نے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم پر متعدد مضامین تحریر کیے اور جب یہ مجموعہ شائع ہوا تو اس کے دیباچے میں لکھا۔ ''مجھے اس کے اعتراف میں تامل نہیں کہ میرے اکثر خیالات دراصل علامہ شبلی کے ان ہی افکار و خیالات کی صدائے بازگشت ہیں۔'' (ص:۱۴۲) اس مقالے کا اختتام مولانا اصلاحیؒ کے ان مقالات کے اشاریے پر ہوا ہے، جو انھوں نے علامہ شبلی کے تعلق سے تحریر کیے ہیں۔'' (ص:۱۴۵-۱۴۶)

.....(۱۰).....

کتاب کا دسواں عنوان '' ڈاکٹر احمر لاری کی یاد میں'' ہے۔ لاری صاحب کا تعلق گورکھ پور یونی ورسٹی سے تھا۔ وہ پی ایچ ڈی میں پروفیسر محمود الٰہی کے شاگرد تھے۔ '' حسرت موہانی اور کارنامے'' کے عنوان سے انھوں نے بڑا وقیع مقالہ لکھا جس پر ۱۹۶۸ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔ وہ اس یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے اور صدرِ شعبہ ہو کر سبک دوش ہوئے۔ ان کی کتابوں میں: ۱- **مختصر تاریخ گورکھپور** ۲- **تذکرۂ**

شعراء از حسرت موہانی ۳- گلدستۂ نازنیناں ۴-اردو تنقید کا ارتقاء(۱۸۳۶ء سے ۱۹۳۵ء) ۵- غالب اور غالبیات وغیرہ ہیں۔ انھوں نے اپنے مکان کا نام ادبستان رکھا ہوا تھا۔(ص:۱۴۸)

ڈاکٹر الیاس اعظمی نے لکھا ہے:"ان کا تحریری سرمایہ طویل عمر کے باوجود مختصر ہے۔ مذکورہ کتابوں کے علاوہ ان کے دامنِ ادب میں چند مضامین، تبصرے اور مقدمے بھی شامل ہیں۔ ان میں افادیت کے لحاظ سے ان کا تحقیقی مقالہ سب سے اہم ہے، جو انھیں ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔" (ص:۱۴۹)

.....(۱۱).....

کتاب کا گیارھواں مضمون" ضیاء الرحمان اعظمی "ہے۔ ضیاء الرحمٰن اعظمی ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور ماہرِ تعلیم تھے۔ بہ قول مصنف وہ تاریخ کے آدمی نہ تھے، مگر انھوں نے اپنی جنم بھومی، جیراج پور، کی تاریخ لکھی،(ص:۱۵۲) شعر و ادب کا ذوق انھیں ورثے میں ملا تھا، پھر ماحول نے اسے مزید نکھارا۔ ان کے دادا، والد، اور دو بھائیوں نے بھی سخن وری کی اور خوب کی۔(ص:۱۵۴)

شعر و سخن میں ان کی شاعری کا ایک پہلو" طنزیہ" بھی ہے۔ انھوں نے متعدد طنزیہ نظمیں لکھیں۔ ان کی ایک مشہور نظم" چمچہ نامہ" ہے، جو کتابی صورت میں شائع ہوئی۔(ص:۱۶۰) مگر آخری دور میں ان کی تمام تر توجہ بچوں کے ادب پر مرکوز ہو گئی۔ انھوں نے آسان زبان میں نظمیں اور مضامین لکھے۔ ان کی نگارشات بچوں کے رسائل میں شائع ہوتی تھیں، مصنف نے لکھا ہے۔"ضیاء الرحمٰن صاحب نے بچوں کے لیے پچاسوں نظمیں کہی ہیں اور اس قدر خوبصورت نظمیں لکھی ہیں کہ اگر انھیں بچوں کو ازبر کرا دیا جائے تو ان کے اندر صالح جذبات کا پیدا ہونا ناممکن نہیں ہے۔" (ص:۱۶۱)

ضیاء اعظمی انگریزی ادب کے بھی ماہر تھے۔ وہ اکثر انگریز شعرا اور ان کی شاعری کا ذکر کرتے تھے، نیز ان کی گفتگو اور کوئی تحریر علامہ اقبالؒ کے ذکر سے خالی نہیں ہوتی تھی، بات بات میں کلامِ اقبال سے استدلال کرتے تھے۔ مصنف نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ" راقم سے بھی مشفقانہ تعلق تھا۔ پی ایچ ڈی کے زمانے میں انھوں نے میرا تعاون کیا تھا۔" (ص:۱۶۳)

.....(۱۲).....

کتاب کا بارھواں مضمون"بدر عالم خاں اعظمی" پر ہے۔ بدر اعظمی کی وجہِ شہرت، ان کی شاعری ہے۔ ۲۰۰۸ء میں ان کا شعری مجموعہ **ہذیان** شائع ہوا۔ ان کا شمار، ادب برائے زندگی اور بامقصد شاعری کرنے والوں میں

سرِ فہرست رہے گا۔ ان کی شاعری میں رومانویت نہیں ہے۔ وہ انسانیت نوازی اور تہذیب و تمدن کے خلاق شاعر تھے، وہ اپنی شاعری کو عبادت سمجھتے تھے، ان کے دیوان کا آخری شعر یہ ہے:

اس کے سب اوراق میں توبہ کے آنسو جذب ہیں
میری بخشش کا وسیلہ یہ مرا دیوان ہے!

(ص:۱۷۱)

انھیں اردو کے ساتھ انگریزی زبان و ادب پر بڑا عبور تھا۔ فارسی اور فرانسیسی زبان سے بھی کسی حد تک واقف تھے۔ ان کی شاعری میں عربی الفاظ کے استعمال کو دیکھ کر ہر شخص گواہی دے گا کہ انھیں عربی بھی اچھی آتی تھی۔ (ص:۱۶۵) مصنف نے ان کے متعدد اشعار نقل کیے ہیں، مثلاً:

تازہ ہوا کے جھونکے سے خود بند ہو گئیں
صدیوں کے بعد آج ہی کھولی تھیں کھڑکیاں

(ص:۱۶۶)

مصرعِ ثانی میں ''صدیوں'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ راقم الحروف کا عاجزانہ خیال ہے کہ صدیوں کی جگہ اگر یہاں ''مُدت'' کا لفظ لکھا جاتا تو شعر مبالغہ سے نکل کر حقیقت کے قریب آجاتا۔

بدر اعظمی کے دو شعر ہمارے شہر بلکہ ملک کے بھی حسبِ حال ہیں:

کس کی چیخوں سے لرزتے ہیں در و دیوار
کون ہے جو رات بھر روتا ہے تیرے شہر میں
جنگلوں میں بھیڑیے کو بھیڑیا کھاتا نہیں
آدمی کو آدمی کھاتا ہے تیرے شہر میں!

(ص:۱۶۹)

.....(۱۳).....

کتاب کا تیرھواں مضمون ''ماہ نامہ معارف کی ادبی خدمات'' پر ہے۔ بہ ظاہر یہ مختصر سا مضمون ہے، جو چار صفحات پر ہے۔ لیکن اس میں جامعیت کی شان پائی جاتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ماہ نامہ **معارف** وہ پرچہ ہے، جسے علامہ اقبال، ابو الکلام آزاد اور عبد الماجد دریابادی نے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ یہ پرچہ صرف مذہبی تحقیقات

پر مشتمل نہیں، بلکہ شعر و ادب اور تحقیق و تنقید بھی روزِ اوّل سے اس کے مقاصدِ اشاعت میں شامل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال، اکبر الٰہ آبادی، اقبال سہیل، جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، فراق گورکھ پوری، حسرت موہانی وغیرہ کی تخلیقات اس میں شائع ہوتی رہی ہیں، جب کہ نثری ادب میں مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی، عبد الماجد دریابادی، مہدی افادی، شاہ معین الدین احمد ندوی وغیرہم کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔ اس رسالے نے لسانیات کے باب میں اردو زبان کی وہ خدمت کی ہے، جس کی نظیر کسی کے پاس نہیں ہے۔ مصنف نے جو یہ لکھا ہے وہ بلاشبہ درست ہے کہ " ہماری ادبی تاریخ میں اس قدر وسیع ذخیرۂ ادب کسی اور رسالے کے صفحات میں شاید ہی موجود ہو۔" (ص:۱۷۶)

.....(۱۴).....

کتاب کا چودھواں موضوع " اعظم گڑھ کا شعری منظر نامہ " ہے۔ اس میں اعظم گڑھ کی خاک سے اٹھنے والے فرزندوں کی شعری خدمات کا تذکرہ ہے، مصنف نے لکھا ہے: "دیارِ پورب میں ضلع اعظم گڑھ قدیم زمانے سے علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے" (ص:۱۷۷) اور یہ کہ ۱۶۶۵ء میں راجہ اعظم خاں نے اسے آباد کیا تھا، مگر انھوں نے اس شہر کا شعری منظر نامہ، علامہ شبلی نعمانی سے شروع کیا ہے جن کی پیدائش ۱۸۵۷ء کی ہے؛ گویا تقریباً دو صدیاں اس عنوان سے خالی ہیں۔ اس عرصے میں کیا کوئی ادیب و سخن ور پیدا نہیں ہوا؟ یقیناً ہوا ہوگا، وگرنہ یہ جملہ کیسے لکھا جاتا کہ " اعظم گڑھ، قدیم زمانہ سے علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔" (ص:۱۷۷)

شبلی کے ذکر کے بعد مولانا فاروق چریاکوٹی کا ذکر ہے۔ جنھوں نے "مسدس عوالی" اور "مسدس فاروقی" لکھی تھیں۔ یہ شبلی کے استاذ ہیں اور یقیناً ان سے ذرا پہلے کے ہیں۔ ان کا ذکر اگر پہلے آجاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ ایک اور شاعر عثمان فدائی کا بھی ذکر ہے، ان کا کلام **دیوانِ فدائی** کے نام سے طبع ہوا۔ انھی کے ہم عصر ایک شاعر نجم عباسی کا بھی ذکر ہے، جن کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی اور ارمغانہ موجود ہے، اس میں ۴۲۸ اشعار ہیں۔ (ص:۱۷۸) محبوب الرحمٰن کلیم کا بھی ذکر ہے، مگر ان کے نامۂ اعمالِ شاعری میں ایک مرثیے کے سوا کچھ دست یاب نہیں ہو سکا، البتہ ان کے قلم سے دو کتابیں **جہاں آراء** اور **الفرائض** ضرور نکلی ہیں۔ (ص:۱۷۹) پھر شبلی کے مشہور شاگرد اقبال سہیل کا تذکرہ ہے۔ ان پر تو مصنف نے ایک الگ تفصیلی مضمون لکھا ہے، یہاں بھی ان کی شاعری کا خوب چرچا ہے، ان کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں: "وہ شاعری نہیں کرتے تھے بلکہ اشعار ان پر نازل ہوتے

تھے۔ اصلاً وہبی شاعر تھے...اگر محض شعر و ادب کے ہو جاتے تو ادبی دنیا کے وہ دوسرے اقبال ہوتے۔"(ص:۱۸۰)

رحمت الٰہی برق اعظمی نے کُل آٹھ دیوان مرتب کیے۔ جن میں سے ابھی تک ایک شائع ہو سکا ہے۔ مجموعے کا نام ہے: **تنویرِ سخن** (ص:۱۸۷) برق اعظمی کے تعلق سے یہ نوٹ، خصوصی اہمیت کا حامل ہے: "ان کی قادر الکلامی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بے نقوط الفاظ میں قطعے کہے۔ ایک قطع میں محض اوپر اور ایک میں محض نیچے نقطے پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک ایسی نعت کہی، جس کے مصرعوں کا ۲۸واں حرف نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے ملا کر پڑھا جائے تو صلوا علیہ وآلہ بر آمد ہوتا ہے۔" (ص:۱۸۷)

امین اعظمی کا دیوان **سرمایۂ امین** مطبوعہ ہے۔ ان کا ایک شعر، سہلِ ممتنع کے حوالے سے رقم کیا گیا ہے، یہ شعر راقم کو بھی پسند آیا ہے، آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

ہوں شاد کہ دل خوگرِ آرام بہت ہے
غم تیرا سلامت، مجھے آرام بہت ہے

خلیل اعظمی کا مجموعہ **گلزارِ سخن** کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ امجد غزنوی کا دیوان **صہبائے خودی** شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ابرار اعظمی کے دو مجموعۂ کلام، **جوہر آئینہ** اور **غبار شیشہ ساعت** شائع ہو چکے ہیں۔ ضیاء الرحمٰن اعظمی، ادبِ اطفال کی طرف متوجہ رہے۔ ان کے دو مجموعے **ننھے منّے چراغ** اور **تاروں کے قافلے** شائع ہوئے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی کی نظموں کا مجموعہ **یہ داغ داغ کہانی** شائع ہوا۔

اس مضمون میں شعر و ادب کے تعلق سے اعظم گڑھ کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دو ادوار کا تعارف تفصیلی ہے اور آخری دو ادوار کا ذکر انتہائی سرسری طور پر کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے دو ادوار کا ذکر پندرہ صفحات پر ہے اور آخری دو ادوار کا ذکر فقط ایک صفحے پر مشتمل ہے۔ (ص:۱۹۳۔۱۹۴) اسے اتنا غیر متوازن نہیں ہونا چاہیے تھا۔

.....(۱۵).....

کتاب کا پندرھواں اور آخری مضمون "امتزاجی ادب: چند معروضات" کے نام سے ہے۔ نو صفحات کا یہ مضمون اپنی نوعیت کا بہت عمدہ، معیاری اور اثر انگیز مضمون ہے۔ اس میں اردو زبان و ادب کی وسعتوں کو مختلف تہذیب و معاشرت اور مذہب و اخلاقیات اور رسم و رواج کے تعلق سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کے لیے اردو

زبان و ادب کی جن جن اصناف اور ان اصناف میں لکھنے والوں یعنی ادیبوں، شاعروں، مرثیہ نگاروں، نقادوں، ناول نگاروں، ہندو بھگتوں، اور صوفیاے کرام کے ملفوظات کے لکھنے والوں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ مصنف نے لکھا ہے: " واقعہ یہ ہے کہ اردو اپنے نام، مزاج، ساخت اور شناخت ہر لحاظ سے ایک مشترکہ تہذیب کی نمائندہ ہے... اردو بنیادی طور پر ایک امتزاجی زبان ہے۔" (ص:۱۹۵) مصنف نے بجا طور پر لکھا ہے:

ڈاکٹر گریرسن کے مطابق ۱۷۹ زبانوں کے ہوتے ہوئے اردو نے اپنی برتری ثابت کی ہے۔ راقم کے خیال میں اس کی بنیادی وجہ اردو کی یہ خوبی ہے کہ اس کے اندر دوسری زبانوں کے الفاظ کو قبول اور جذب کرنے کی صلاحیت ہے اور یہی وہ خوبی ہے، جس کی وجہ سے اردو نے بہت جلد ارتقاء کی منزلیں طے کیں اور ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک بولی جانے لگی۔ اردو کی یہ خوبی اس بات کی بھی تصدیق کرتی ہے کہ اردو سے پہلے اور اردو کے ساتھ یہاں جو زبانیں رائج تھیں، ان میں امتزاج و انجذاب کی خوبی موجود نہ تھی۔ (ص:۱۹۶)

مصنف نے اپنے موقف کے حق میں متعدد شخصیات کے حوالے دیے ہیں اور ایک جگہ نظیر اکبر آبادی کو ہندوستانی تہذیب اور مشترکہ کلچر کا شاعر قرار دیا ہے۔ (ص:۱۹۸) اسی طرح مصنف نے یہ مثال بھی اچھی دی ہے: "ناول اور افسانوں پر نظر کی جائے تو راقم کا خیال ہے کہ یہ دوسرے اصناف کے مقابلے میں زیادہ امتزاجی رویوں اور روایتوں کے حامل ہیں۔ اس کا آغاز اگر ڈپٹی نذیر احمد ہیں تو اس کا شباب منشی پریم چند، جن کے زبان و بیان کی داد شبلی جیسے نقاد نے بھی دی ہے۔" (ص:۲۰۲)

غرض اردو زبان و ادب کی ترقی میں ہندوؤں کی خدماتِ جلیلہ کو اس مضمون میں بے حد سراہا گیا ہے اور مصنف نے اپنے موقف کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ بلاشبہ یہ مضمون بار بار پڑھنے کے لائق ہے اور اس قابل ہے کہ اسے بار بار شائع کیا جائے۔

.....(۱۶).....

اور اب وہ جملے فقرے اور الفاظ ملاحظہ کیجیے، جو راقم الحروف کے نزدیک قابلِ تصحیح ہیں، بعض میں سہوِ کتابت کا امکان بھی موجود ہے۔

پوچھا ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ راز دار
کیوں کر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد

(ص:۶۵)

یہاں 'پوچھا' نہیں 'پوچھ' آئے گا۔

''فطرت نے انھیں موزوں طبع پیدا ہی کیا تھا۔''(ص:۱۰۲) صحیح یہ ہے:''فطرت نے انھیں موزوں طبع ہی پیدا کیا تھا۔''

''اپنے موضوع پر معرکتہ الآراء تصانیف بھی ہیں۔'' (ص:۱۳۱) صحیح لفظ معرکہ آرا ہے، جیسا کہ خود مصنف نے متعدد مقامات پر صحیح لفظ لکھا ہے۔(دیکھیے ص:۱۴۳، ۱۷۴، ۱۸۶)

''۷ر فروری کو ریڈیو تقریر کی ریکارڈنگ کے لیے گورکھپور گیا۔'' (ص:۱۴۹) یہاں سنہ لکھنا ضروری تھا۔

''ان کا قلم نیام سے باہر آجاتا ہے۔'' (ص:۱۶۳) قلم نیام میں کب ہوتا ہے؟ نیام میں تو تلوار ہوتی ہے؛ عبارت یوں ہوتی تو مناسب ہوتا: ''ان کی شمشیر قلم، نیام سے باہر آجاتی ہے۔''

''پی ایچ ڈی کے زمانے میں انھوں نے میرا تعاون کیا تھا۔'' (ص:۱۶۳) یہاں ''میرا'' کی جگہ '' مجھ سے'' آنا چاہیے تھا۔

''بدر عالم ذہانت و فتانت کا پُتلہ تھے۔'' (ص:۱۶۵) فتانت جس معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، اسے 'ت' کے بجائے 'ط' سے لکھا جاتا ہے، یعنی فطانت، اور ''پُتلہ'' کی جگہ ''پُتلا'' ہونا چاہیے تھا۔

''لیکن اس سے اس کا امتیاز یعنی امتزاج اور رواداری ختم نہیں ہوا۔'' (ص:۲۰۴) عبارت میں (امتزاج اور رواداری) کو قوسین میں لکھا جاتا تو جملہ زیادہ رواں بلکہ مناسب ہوتا۔